جاری کیا۔ روزنامہ ''زمانہ'' اور روزنامہ ''انقلاب زمانہ'' کے بھی ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۳۷ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے وابستہ ہوئے اور سات جلدوں میں جواہر سخن مرتب کی۔ فلسفہ سیاست، فلسفہ عمر اور ترجمہ قانون مسعودی بھی ان کی نثری کتابیں ہیں۔ لیکن وہ ایک شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کا دیوان ''میکدۂ کیفی'' کے نام سے شائع ہوا اور غزلوں کا ایک انتخاب انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا تھا۔ چھ نظموں پر مشتمل ایک مجموعہ ''پارہ پارہ ہائے جگر'' بھی شائع ہوا تھا۔

۱۹۴۳ء میں کیفی صاحب کا تقرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں ہوا اور انھوں نے مشرقی علوم کی کتابوں کی فہرست مرتب کی۔ ۱۹۵۶ء میں اٹاوہ میں وفات پائی۔

۵۵۔ جناب یحییٰ اعظمی :

آبائی وطن قصبہ مہراج گنج ضلع اعظم گڑھ تھا لیکن انھوں نے اعظم گڑھ شہر میں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی۔ تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن اپنی محنت و مطالعہ سے اردو فارسی کی استعداد بہت بڑھالی تھی اور دونوں میں فکر سخن فرماتے تھے۔ تھوڑی بہت انگریزی بھی سیکھ لی تھی۔

مڈل اسکول پاس کر کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکول میں معلم ہو گئے تھے مگر تحریک ترک موالات کے اثر سے ۱۹۲۵ء میں ڈسٹرکٹ بورڈ کی نیم سرکاری ملازمت ترک کر کے دارالمصنفین کے دفتر میں ملازم ہو گئے اور پھر تاعمر اسی ادارہ سے وابستہ رہے۔ شاعری میں مولانا اقبال احمد سہیل سے تلمذ کا فخر حاصل تھا اور ان کے کلام پر علامہ شبلی اور مولانا سہیل کے کلام کا نمایاں اثر تھا خصوصاً موخر الذکر کے رنگ میں اتنا ڈوبا ہوا ہوتا تھا کہ اہل نظر کو ان کے کلام پر استاد کے کلام کا دھوکہ ہوتا تھا۔ ''نوائے حیات'' اور ''نوائے عصر'' کے نام سے دو مجموعہ شائع ہوئے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے بڑی عقیدت تھی۔ مولانا نے ان کی قومی و وطنی شاعری کے سلسلہ میں مرکزی حکومت سے ان کا ایک صد ماہوار وظیفہ مقرر کرایا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے بھی بڑا تعلق رکھتے تھے۔

یحییٰ صاحب کی طبیعت میں بڑی لطافت و نظافت پسندی تھی۔ معمولات و اوقات کی پابندی، شرم وحیااور عفت وپاک دامنی میں بے مثال تھے۔ بڑے کم آمیز خاموش آدمی تھے۔ عملی و ہنگامی جدوجہد سے واسطہ نہ رکھتے تاہم دبستان شبلی و سہیل کے نہایت خوش گواور خوش فکر شاعراور مدیرالاصلاح کے بڑے بے تکلف دوست تھے۔ ۲۲/ فروری ۱۹۷۲ء کو وفات پائی۔

۵۶۔ الاصلاح (شذرات) ۳/ ۱۱، نومبر ۱۹۳۸ء، ص ۶۴۶۔۶۴۸

۵۷۔ الاصلاح (شذرات)، ۴/ ۱۱، نومبر ۱۹۳۹ء، ص ۵۷۸

مولانا امین احسن اصلاحی اور تزکیہ نفس

عبدالخالق فاروقی

مولانا امین احسن اصلاحیؒ عہد حاضر کی نابغۂ روزگار شخصیات میں سے تھے۔ وہ بر صغیر ہندوپاک کے معروف محقق قرآن علامہ حمید الدین فراہیؒ کے شاگرد تھے۔ پورے پانچ سال ان کی صحبت میں رہ کر ان سے قرآن فہمی کے اصول سیکھے۔ انہی اصولوں کو رہنما بنا کر قرآن میں تدبر و تفکر کو انھوں نے اپنی زندگی کا منتہائے مقصود بنایا اور اپنے نتائج فکر کو اپنی مختلف تصنیفات میں مرتب کیا۔ اس کی ایک بہترین مثال ان کی تفسیر تدبر قرآن ہے، جسے بجا طور پر اس مکتب فکر کا دائرۃ المعارف کہا جاسکتا ہے۔ ان کی دوسری اہم کتابیں حقیقت شرک و توحید، دعوت دین اور اس کا طریقۂ کار، اسلامی ریاست، فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں اور تزکیہ نفس ہیں۔ ان تمام کتابوں کی امتیازی شان یہ ہے کہ ان میں خالص قرآنی فکر جلوہ گر ہے۔ مولانا کا اپنا کہنا ہے کہ انھوں نے عمر بھر قرآن فہمی کو محور بنا کر پڑھا، سوچا اور لکھا ہے۔ دیگر علوم جیسے عربی ادب، حدیث، فقہ، تاریخ، سیاسیات، تصوف اور فلسفہ وغیرہ بھی مولانا کے مطالعہ کے اہم موضوعات میں شامل تھے لیکن ان علوم کو انھوں نے قرآن کے توابع کی حیثیت سے پڑھا۔ مولانا کے اس طرز فکر کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے تمام اسلامی اور دینی علوم کے لئے قرآن ہی کو کسوٹی بنایا ہے۔ جو چیز قرآن کی کسوٹی پر پوری اترے وہ قابل قبول ہے اور جو چیز اس معیار پر پوری نہ اترے وہ رد کر دینے کے قابل ہے۔ حقیقتاً یہ طرز تفکر مولانا اصلاحی کی عظمت کی ضمانت ہے۔ زندگی بھر مولانا کی بنیادی وابستگی، قرآن و حدیث اور فقہ و عربی ادب ہی سے رہی۔ وہ ایک صاحب طرز

ادیب اور بلند پایہ خطیب بھی تھے۔ ان کا تعارف اور پہچان بالعموم انہی حیثیات سے ہے لیکن ان کی کئی کتابوں بالخصوص تدبر قرآن اور تزکیہ نفس کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ صرف مفسر، محدث اور فقیہ نہ تھے بلکہ خالص اسلامی اصول و آداب تزکیہ کے ایک بڑے رمز شناس بھی تھے اور بلا مبالغہ یہ چیز ان کے تدبر قرآن کے ہی فیوض و ثمرات میں شامل ہے۔

تزکیۂ نفس اور معرفت الٰہی تصوف کا بھی موضوع ہے۔ لیکن اکابر تصوف کی کتابوں میں معرفت الٰہی کا مفہوم، اس کے حصول کے ذرائع اور تزکیۂ نفس کے جو طریقے بیان ہوئے ہیں عام طور سے قرآن و سنت میں ان کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ مولانا اصلاحی نے معروف متصوفین کی کتابوں کا تنقیدی مطالعہ کیا، اسے قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھ کر جانچا اور اس نتیجہ تک پہنچے کہ تصوف اسلام کے متوازی ایک دین ہے جس کا منبع و ماخذ قرآن نہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :

"تصوف کے متعلق یاد رکھئے کہ یہ ایک الگ دین ہے جس کا منبع و ماخذ قرآن نہیں۔ اس میں تورات اور انجیل کی تعلیم بھی ملتی ہے۔ بدھا کے فلسفے کی جھلک بھی موجود ہے، یونانی فلسفہ کے آثار بھی ہیں اور ہندو فلسفہ کی باتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ جہاں جہاں سے اہل تصوف کو جو بات بھی اپنے ذوق کی ملی ہے، انھوں نے لے لی ہے۔ چنانچہ قرآن و حدیث میں بھی جو چیز انھیں اپنے ذوق کی ملی، وہ انھوں نے اس میں ڈال لی ہے۔ لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ تصوف کی بنیاد قرآن و حدیث ہے۔ تصوف میں اصحاب علم صرف چند ایک ہیں۔ مثلاً شاہ ولی اللہ ایک ذی علم آدمی ہیں، غزالی ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں، ابو اسماعیل ہروی کا شمار حنبلی علماء میں ہوتا ہے۔ یہ لوگ قرآن و حدیث سے واقف ہیں۔ میں نے ان سب کی کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ ان کو پڑھنے کے بعد میں تصوف پر تنقید کرتا ہوں۔ اس مطالعہ سے میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ تصوف کا اکثر حصہ قرآن و سنت کے بالکل خلاف ہے۔ اس

نے توحید اور آخرت کے عقائد کی بنیادیں ہلادی ہیں۔ مسلمانوں کو بدعات کے گورکھ دھندے میں ڈال دیا ہے۔ جو چیز عقائد کی بنیادیں ہلادے اس کو آپ قرآن سے نہیں جوڑ سکتے۔ اس کے لئے ایک ہی طریقہ ہے کہ بحیثیت مسلمان قرآن کو کسوٹی مانیں اور تصوف کو اس پر پرکھیں اور اتنے حصے کو مان لیں جو اس کسوٹی پر پورا اترتا ہو۔"(۱)

اپنی کتاب تزکیہ نفس میں مولانا نے تصوف کے رائج کردہ طریقوں اور فلسفہ پر تنقید کر کے قرآن و حدیث کے بتائے ہوئے تزکیۂ نفس کے طریقے کی طرف رہنمائی کی ہے۔ تصوف میں تزکیہ زندگی کے ایک نہایت محدود گوشے سے تعلق رکھتا ہے لیکن انھوں نے جس طریقے کی طرف رہنمائی کی ہے وہ جہاد زندگانی کی کشمکش اور جدوجہد سے عبارت ہے جس سے انسان کی شخصیت کی ترقی اور نشوونما ہوتی ہے۔ اور اس کی غایت تخلیق کی تکمیل ہوتی ہے۔

تزکیہ کا لغوی مفہوم کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا، نشوونما دینا اور پروان چڑھانا ہے اور اس کا اصطلاحی مفہوم نفس کو غلط رجحانات و میلانات سے موڑ کر نیکی اور خدا ترسی کے راستے پر ڈال دینا اور اس کو درجہ کمال پر پہنچنے کے لائق بنانا ہے۔ تزکیۂ نفس تمام دین و شریعت کی غایت اور انبیاءؑ کی بعثت کا اصلی مقصود ہے۔ آخرت میں انسان کی فلاح و نجات نفس کے تزکیہ پر موقوف ہے: "قدافلح من تزکی" (الاعلی: ۱۴)۔ تزکیہ کا یہ عمل زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اس سے بے تعلق نہیں۔ اس اعتبار سے تزکیہ کوئی سادہ اور مفرد عمل نہیں بلکہ یہ کئی اجزاء سے مرکب ہے۔ اس کا موضوع نفس انسانی ہے اور نفس انسانی جامع ترالفاظ میں علم، عمل اور تعلقات و معاملات کا مجموعہ ہے۔ مولانا نے نفس انسانی کے اسی مجموعہ کو مدنظر رکھ کر اس کے تزکیہ کے فکری اور عملی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

علم کا تزکیہ یہ ہے کہ انسانی ذہن میں فطری طور پر ابھرنے والے ان سوالات کا اسے تشفی بخش جواب مل جائے کہ اس کائنات کا خالق و مالک کون ہے۔

انسان کے لئے گوناگوں نعمتوں کا خوان نعمت بچھانے والی ذات کون ہے اور اس کی صفات کیا ہیں؟ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی اور اس کی غایت کیا ہے؟ اس کائنات کا انسان سے اور انسان کا اس کائنات سے کیا تعلق ہے؟ اور اس کائنات میں انسان کی حقیقت کیا ہے؟ ان سوالات کے صحیح جواب سے انسان کے قلب و روح کو حقیقی طمانیت حاصل ہوتی ہے اور انہی سے علم حقیقی کی راہیں کھلتی ہیں۔ یہی وہ سرا ہے جو مل جائے تو اس کائنات کا سارا الجھاؤ لمحہ بھر میں سلجھ سکتا ہے اور اگر نہ ملے تو انسان قیامت تک سرمار تا رہے لیکن وہ کسی ایک گرہ کو بھی نہیں کھول سکتا۔ جب آدمی کو اس کائنات کے خالق و مالک کا سراغ مل گیا تو اس کو گویا وہ شاہ کلید مل گئی جس سے علم حقیقی کے تمام دروازے کھولے جا سکتے ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حقیقی علم جس سے انسان کی روح اور قلب کو طمانیت حاصل ہوتی ہے اس کا سرچشمہ خدا کی معرفت ہے اور خدا کی معرفت کا مفہوم مولانا کے نزدیک یہ ہے کہ خدا کے متعلق صرف ان باتوں کا جاننا ضروری ہے جن کو انسان جان سکتا ہے۔ اور جن کو جان لینے کے بعد اس کی عقل مطمئن ہو جاتی ہے۔ معرفت الٰہی سے متعلق جس حد تک اس کے حیطۂ ادراک میں ہے وہ یہی ہے اس سے آگے نہ اس کی رسائی ہے اور نہ اس سے آگے کا علم اس کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً تفصیلی دلائل کے ساتھ اس بات کا علم کہ خدا ہے، پوری وضاحت کے ساتھ خدا کی صفات کا علم، خدا کی پسند و ناپسند کا علم، افراد اور جماعتوں کے ساتھ خدا کا معاملہ کرنے کے متعلق قوانین کا علم اور اس بات کا علم کہ مرنے کے بعد بھی اسی سے سابقہ پڑنے والا ہے اور وہ اپنے نیک اور بد بندوں کے ساتھ اس اس طرح کا معاملہ کرنے والا ہے۔

صوفیاء خدا کی معرفت کے باب میں اس کی صفات اور پسند و ناپسند معلوم کرنے کے بجائے اس کی ذات کو موضوع بحث بناتے اور دعوی کرتے ہیں کہ وہ خدا کی تجلیات و انوار کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مولانا اس نظریہ کو گمراہی، جہالت اور گستاخی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ فلسفۂ قرآن کی رو سے ذات الٰہی اور اس کی تجلیات

کے مشاہدہ کی تاب حضرات انبیاء علیہم السلام نہ لا سکے تابد یگراں چہ رسد!

اس سے آگے اہم تر سوال یہ سامنے آتا ہے کہ خدا کی معرفت کے حصول کا ذریعہ کیا ہے۔ اس سوال کی اہمیت یہاں اس اعتبار سے دوچند ہو جاتی ہے کہ اس کا جواب فلاسفہ، متکلمین اور ارباب تصوف نے بھی اپنے اپنے رنگ میں دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ تمام گروہ تضاد فکر اور فساد فکر کا شکار ہوئے اور اس سوال کا صحیح جواب تو کیا دیتے، معاملے کو پیچیدہ تر بنا دیا۔

ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں

خدا کے کسی بھی نوعیت کے قائل قدیم اور جدید فلاسفہ خدا کی معرفت کے لئے تنہا انسان کی عقل اور فطرت کو کافی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عقل کا نور چراغ راہ نہیں بلکہ منزل ہے اور عقل مابعد الطبیعاتی مسائل کو حل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ لہذا انسان خدا کی معرفت کے لئے کسی خارجی رہنمائی کا محتاج نہیں۔

متکلمین بالخصوص اشاعرہ کا نظریہ فلاسفہ کے برعکس ہے۔ وہ انبیاء کی لائی ہوئی تعلیم کی عقل سے قدر و قیمت معلوم کرنے کے قائل نہیں۔ اس معاملے میں وہ عقل کو اندھا قرار دیتے ہیں۔ انبیاء کی صداقت کا ذریعہ ان کے نزدیک معجزات ہیں۔

صوفیاء کا گروہ خدا کی معرفت کا ذریعہ وجدان، کشف والہام اور مشاہدہ کو قرار دیتا ہے۔ یہ لوگ علم شریعت کا استخفاف کرتے ہیں اور اسے علم ظاہری سمجھتے ہیں۔ شریعت کے بالمقابل علم لدنی کو افضل تصور کرتے ہیں اور اسے باطنی علم کا نام دیتے ہیں۔ یہ علم اپنی دلیل آپ ہوتا ہے اور کسی خارجی دلیل سے مستغنی ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک معرفت کی تعریف کسی شے کی اصل حقیقت کا جیسی کہ وہ فی الواقع ہے احاطہ کر لینے کا نام ہے۔ خدا کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت کو جس کا ذریعہ انبیاء ہیں، وہ عوام کی معرفت سمجھتے ہیں۔ خواص کی معرفت ان کے نزدیک معرفت ذات ہے۔ اس سے بھی آگے اخص الخواص کی معرفت ہے، جو حقیقی معرفت ہے۔ وہ عقل و استدلال اور دلیل و شہادت سے ایک بالکل ماوراء شے ہے۔ یہ معرفت جن کو

حاصل ہو جاتی ہے وہ حقائق کو دلیل سے معلوم کرنے کے بجائے ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ علم کے حدود و قیود سے بالاتر اور خود مشہود حقیقی کے اندر گم ہو جاتے ہیں۔

مولانا نے ان میں سے ہر ایک گروہ کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے اور ان کا سخت علمی محاکمہ کیا ہے۔ ان کے نظریات کو تنقید کا ہدف بنا کر قرآنی فکر کے ذریعہ ان کی غلطی بے نقاب کی ہے۔

جہاں تک فلاسفہ کا تعلق ہے مولانا کی رائے یہ ہے کہ عقل اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے لیکن اس کی رسائی محدود ہے۔ یہ حالات اور جذبات کی رو میں بھی بہ سکتی ہے اور خطا اور غلطی سے بھی پاک نہیں۔ مابعد الطبیعاتی مسائل کا حل اس کی دسترس سے باہر ہے۔ لہذا فلاسفہ کی رائے قطعاً غلط ہے۔ رہے متکلمین تو انھوں نے عقل کو کلیۃً خارج از بحث قرار دے کر عقل کی ناقدری کی ہے۔ محدود رسائی کے باوجود عقل افادیت سے خالی نہیں ہے۔ وہ اس کائنات کے نظم و حکمت کا مطالعہ اور مشاہدہ کر کے ایک خالق اور اس کی بہت سی صفات اور ان صفات سے خالق کی پسند کے متعلق ایک تصور قائم کر سکتی ہے۔ نیز وہ تخلیق کائنات پر غور کر کے ایک روز جزا و سزا کا خیال کر سکتی ہے۔ تاہم اس کی صحت و صداقت پر غیر مشروط اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یہی اس میں خلا ہے اور اس خلا کو صرف وحی نبوت پر کر سکتی ہے۔ صوفیاء کا سارا فکر و فلسفہ قرآن کے صریح خلاف ہے۔ معرفت کی یہ تعریف کہ یہ کسی شے کی حقیقت کو جیسی کہ وہ ہے احاطہ کر لینے کا نام ہے، محض دعویٰ ہے۔ معرفت کی اس تعریف کی رو سے کسی ادنی سے ادنی چیز کی بھی معرفت حاصل نہیں کی جا سکتی چہ جائیکہ خدا کی ذات، اس کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت حاصل ہو سکے۔ وہ تو ہمارے خیال و گمان اور قیاس و وہم سے برتر اور بالاتر ذات ہے۔ معرفت الٰہی کا ذریعہ وجدان، کشف و الہام اور مشاہدہ کو قرار دینے کا نظریہ بھی بالبداہت غلط ہے۔ علم شریعت کی بنیاد وحی پر ہوتی ہے اور وحی میں کسی وہم، وسوسہ، نفسانی خیال آرائی اور شیطان کی دراندازی کا کوئی امکان نہیں کیونکہ انبیاء بالکل معصوم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جس علم کی بنیاد

وجدان، کشف و مشاہدہ یا الہام پر ہو اس میں ہر قسم کی شیطانی اور نفسانی مداخلت کا امکان ہوتا ہے کیونکہ کسی بڑے سے بڑے عارف اور صوفی کے متعلق عصمت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اس دعویٰ کو تسلیم کر لینے کے معنی یہ ہیں کہ عارفین کو انبیاء کا درجہ دے دیا جائے اور کشف و الہام اور مشاہدہ کو ہم پلہ وحی بنا دیا جائے۔ ایسا دعویٰ دین میں ایک شدید فتنہ ہے۔ بہت سے صوفیوں نے کشف و الہام کی بدولت اپنے آپ کو شریعت کی پابندیوں سے بالاتر قرار دے ڈالا۔ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔ قرآن کی رو سے انبیاء ایمان بالغیب کی دعوت دیتے ہیں اور لوگوں کو عقل و استدلال سے کام لینے اور آفاق و انفس میں غور کرنے پر ابھارتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی دعوت کے لئے وہ بیکار سمجھتے ہیں جو تفکر و تدبر کے بجائے ہر حقیقت کے مشاہدہ و معائنہ کے طالب ہوں۔ معرفت ذات کا تصور بھی قطعاً باطل ہے۔ خدا کی ذات کی کماحقہ معرفت تو درکنار اس کا سرے سے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ قرآن نے جس قدر بھی بحث کی ہے، خدا کی صفات، افعال اور اس کے قوانین و سنن سے کی ہے۔ اس کی ذات سے کوئی بحث نہیں کی ہے اور اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ اس دنیا میں انسان خدا کی تجلی کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ اخص الخواص کی معرفت کا تصور خالص وحدت الوجود کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی رو سے شریعت کا علم نہ تو اس معرفت کا ذریعہ ہی ہو سکتا ہے اور نہ وہ اس معرفت پر کوئی حکم ہی لگا سکتا ہے کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ ان حضرات کے نزدیک عارف صاحب حال ہوتا ہے اس پر مجرد ایک صاحب قال کو کوئی حکم لگانے کا حق نہیں ہے۔ یہ نظریہ قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں انسان کو اپنے جی سے کچھ کہنے کا حق نہیں دیا ہے۔ فرمایا: فلا تضربوا للہ الامثال" (النحل: ۷۴) تو تم اللہ کے لئے جی سے مثالیں بیان نہ کرو۔

ایک ماثور دعاء میں بندے کی زبان سے خدا کی صفات کے باب میں یہ اعتراف عجز نقل ہوا ہے: "لا احصی ثناء علیك انت کماانثیت علی نفسك" میں تیری ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا تو ویسا ہی ہے جیسی تو نے اپنی ثنا بیان فرمائی ہے۔

انسان اگر اپنے جی سے اللہ تعالیٰ کی صفتیں بیان کرے گا تو وہ اس کو اپنی خواہشوں کے مطابق ایک مہادیو بنا کے رکھ دے گا۔ اور پھر اپنے سارے دین کو اپنے اسی غلط تصور کے تحت اپنی خواہش کے سانچہ میں ڈھال لے گا۔

فلاسفہ، متکلمین اور ارباب تصوف کے نظریات و فلسفہ پر تنقید و محاکمہ کرنے کے بعد مولانا نے بتایا ہے کہ معرفت الٰہی کے حصول کا صحیح، قابل اطمینان اور معتبر ذریعہ انبیاء ہیں۔ انبیاء پر اترنے والی وحی ہر قسم کے اختلاط والتباس اور شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی شیطانی دراندازی یا وہم اور وسوسہ کی آمیزش نہیں ہوتی۔ یہی علم حقیقی کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ وحی نبوت کا محفوظ ترین سرچشمہ اب دنیا میں قرآن مجید ہے۔ اس کو اتارتے وقت بھی اور پھر قیامت تک کے لئے اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی انتظام کے ذریعہ اس کو شیاطین جن وانس کی دست برد سے محفوظ کر دیا۔ لیکن اس کی ہر تلاوت معرفت الٰہی اور تزکیہ نفس کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ اس سے یہ مقصود حاصل کرنے کے لئے یہ ضروی ہے کہ آدمی قرآن مجید کی تلاوت ہدایت کی سچی طلب کے ساتھ کرے۔ اس کی عظمت و اہمیت اور بالاتر کلام ہونے کا شعوری احساس رکھے، جان کی ہربازی کھیل کر اس کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم کرلے۔ اس کو دماغ بند کر کے نہیں بلکہ تدبر اور تفکر کے ساتھ پڑھے اور اس کی حکمت و معارف تک پہنچنے کی سعی کرے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس راہ میں اس کو جو مشکلات اور دشواریاں پیش آئیں ان کو اس کے نازل کرنے والی ذات کی بارگاہ میں پیش کرے اور خلوت کی نمازوں میں قرآن کی تدبر و ترتیل سے تلاوت کر کے اللہ تعالیٰ سے برابر ان کے حل ہونے کی دعا کرتا رہے۔ مولانا کے نزدیک حصول معرفت کا یہ فکری طریقہ ہے۔ عملی طریقہ رسول ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہے جو قرآن کا ایک چلتا پھرتا نمونہ ہے۔ لیکن آپ کے اسوۂ حسنہ سے فیض یاب ہونے کے لئے ناگزیر ہے کہ آپؐ کی ذات گرامی سے متعلق پائی جانے والی غلط فہمیاں دور کی جائیں اور آپؐ کے ساتھ تعلق کی بنیادیں صحیح ہوں۔ نبی ﷺ محض دیانت دار نامہ بر ہی نہیں بلکہ معلم، مزکی، مبشر،

منذر اور ہدایت کا چراغ بھی ہیں۔ آپؐ نے شریعت اور طریقت کے دو الگ نظام زندگی نہیں دیئے بلکہ صرف شریعت الٰہی دی ہے جو بلا تخصیص سب انسانوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہے۔ حضورؐ کی ذات اندھی بہری عقیدت کا مرجع نہیں کہ ان کی یاد میں جلوس نکال دینے، جلسے کر دینے یا چند نعرے لگا دینے سے عقیدت کی تکمیل ہو جاتی ہو، خواہ عملی زندگی ان کی تعلیم سے کتنی مغائرت کیوں نہ رکھتی ہو۔ آپؐ کے ساتھ تعلق کی صحیح بنیادیں یہ ہیں کہ آپؐ کی رسالت و صداقت پر پختہ اور غیر مشروط ایمان لایا جائے۔ اس بات پر یقین ہو کہ آپؐ کی لائی ہوئی تعلیم ہی اصل ہدایت ہے، اس کے خلاف ہر چیز گمراہی ہے۔ زندگی کے ہر معاملہ میں آپؐ کی اطاعت اور پیروی کی جائے اور قلب کی گہرائی کے ساتھ آپؐ کا اتباع کیا جائے اور آپؐ کے ساتھ ایسی محبت رکھی جائے جس کے آگے زندگی کا ہر رشتہ ہیچ ہو جائے۔ ایسے ہی تعلق کے ساتھ بندہ دراصل خدا کا محبّ اور محبوب بنتا ہے۔

اس کے بعد نہایت تفصیل سے مولانا نے ایک ماہر طبیب کی طرح علم حقیقی اور معرفت الٰہی کے امراض (حجابات و آفات) کی تشخیص کی ہے اور ان کا علاج بھی بتایا ہے۔ ان کے نزدیک حجابات لاعلاج اور آفات عارضی اور قابل علاج امراض ہیں۔ ان مباحث کا مطالعہ کرتے ہوئے انسان پر بے اختیار وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور حیرانی ہوتی ہے کہ قرآن میں غواصی کر کے اور حدیث میں غور و فکر کر کے مولانا اصلاحیؒ علم و معرفت کے کس اونچے درجے پر پہنچ گئے تھے!

ان کے نزدیک علم و معرفت کے حجابات چار ہیں: حب عاجلہ یعنی آخرت کی نعمتوں کے مقابل دنیا کی راحتوں کو ترجیح دینا، تکبر یعنی حق سے انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا، عصبیت جاہلیت یعنی حق خواہ کتنا ہی واضح ہو قدیم رسم و رواج اور آباء و اجداد کے طریقے پر اڑے رہنا اور حق کو نہ ماننا۔ غفلت یا لاپرواہی یعنی غیر سنجیدہ رہنا اور زندگی کو بے مقصد اور وقت گزاری کی چیز سمجھنا۔

آفات علم و معرفت سات ہیں: غفلت اور بے پرواہی، خواہشات نفس کی

پیروی، عدم احتساب، بدعت، تحریف، کتمان حق اور اشتغال بالادنیٰ۔ ان بیماریوں کے عام اسباب اپنے مرتبہ سے بے خبری، پست ہمتی، ادنی پرستوں کی دنیا میں کثرت، اصلاح معاشرہ کی ذمہ داریوں سے پہلو تہی، خوف و طمع، غلو، بے حمیتی اور مداہنت ہیں ان کا علاج کتاب الٰہی اور احادیث رسول کا غور و فکر سے مطالعہ، صالح لوگوں کی صحبت و معیت اور شریعت کی پابندی کا عزم ہے۔

تزکیہ علم و معرفت کے بعد مولانا نے تزکیہ عمل پر بحث کی ہے۔ عمل کے پانچ محرکات بیان کئے ہیں۔ ضروریات، خواہشات، شہوات، جذبات، اور نفس ناطقہ۔ ان میں سے پہلے چار محرکات تو اندھے بہرے ہیں اور انسان کو حلال و حرام کی تمیز سے بے پروا بنا کر اپنے مرغوبات اور مطلوبات کی تکمیل پر ابھارتے ہیں۔ پانچواں محرک البتہ عقلی اور اخلاقی ہے۔ اس میں روح ملکوتی بھی ہوتی ہے تاہم اس کا نقص اس کا یک رخاپن ہے جو جذبات کی رو میں بہہ کر زندگی کو غیر متوازن بنانے کا باعث بن سکتا ہے۔ ان محرکات کو اعتدال پر رکھنے کے لئے اسلام نے دو باتیں ضروری قرار دی ہیں ایک یہ کہ تمام محرکات کا حقیقی مطلوب خدا کی رضا جوئی ہو۔ دوسری یہ کہ یہ محرکات اپنی سرگرمیوں میں حدود الٰہی کے پابند ہوں اور یہ مقام حاصل کرنے کے لئے بھی دو چیزیں ضروری ہیں۔ ذکر الٰہی اور فکر آخرت۔ ذکر الٰہی سے مراد یہ ہے کہ انسان زندگی کی جدوجہد اور کشمکش میں ہر موڑ پر برابر اللہ سے ڈرتا رہے اور اس کی پسند و ناپسند کا خیال رکھے۔ فکر آخرت یہ کہ انسان لذات دنیا میں گم ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اس حقیقت کو سامنے رکھے کہ ایک دن اللہ تعالیٰ کو اپنے ہر قول و فعل کا حساب دینا ہے۔ ذکر الٰہی اور فکر آخرت کے امراض غفلت، حب دنیا اور خواہشات و شہوات اور جذبات کے مطالبات ہیں۔ غفلت کا علاج نماز، حب دنیا کا انفاق فی سبیل اللہ، خواہشات و شہوات کا علاج روزہ اور ان تمام امراض کا جامع علاج حج ہے۔

مولانا اصلاحیؒ نے ان پر ایسے دلکش، حسین اور اچھوتے پیرائے میں گفتگو کی ہے کہ یہ عبادات طبیعت پر بوجھ محسوس ہونے کے بجائے روحانی لذت اور قلبی

سرور و طمانیت کا ذریعہ معلوم ہوتی ہیں اور پروانہ وار طبیعت ان کی طرف مائل ہوتی ہے۔ نماز کی ایک ایک چیز غفلت کو دور کرنے والی ہے۔ جسم اور کپڑوں کی صفائی، وضو، اوقات نماز، ہیئت نماز اور نماز میں پڑھی جانے والی دعائیں انسان کے جسم اور قلب و روح کو فرحت و تازگی اور کیف و لذت سے ہمکنار کرتی ہیں۔ نماز کی آفات میں سے سستی، کلمات نماز کے معانی سے عدم واقفیت، ارکان کی تکمیل میں کمی اور ریا وغیرہ ہیں۔ ان کا علاج ان چیزوں کو چھوڑنا ہے۔ حب دنیا کا علاج انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اس سے حب مال پر کاری ضرب لگتی ہے اور بندہ کا تعلق خالق اور خلق سے جڑتا ہے۔ حاجت مندوں کی دعاؤں سے مال میں برکت ہوتی ہے اور حکمت نصیب ہوتی ہے۔ جسے قرآن خیر کثیر سے تعبیر کرتا ہے۔ انفاق کی آفات میں سے آمادگی نفس کا فقدان، احسان جتلانا، سائلوں سے بد سلوکی، تکبر، ریا اور احساس برتری ہے۔ ان کا علاج یہ ہے کہ بندہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات کو یاد رکھے اور انفاق صرف اسی کی خوشنودی اور شکر کے لئے کرے۔ شہوات و خواہشات اور جذبات کا علاج روزہ ہے۔ نفس انسانی کی تربیت و اصلاح، شہوانی میلانات کو کم کرنے، قوت ارادہ کو مضبوط بنانے، جذبہ ایثار کی نشوونما اور روح ملکوتی کی ترقی میں روزہ کا اہم کردار ہے۔ روزہ بطن و فرج کے فتنوں کا دروازہ بند کر دیتا ہے، تبتل الی اللہ، خلوت و خامشی اور ذکر و فکر کا ایک خاص ماحول فراہم کرتا ہے۔ یہ چیزیں قرآن میں تفکر و تدبر کے لئے نہایت موزوں ہیں اس وجہ سے روزہ قرآن مجید کے ساتھ گہری مناسبت رکھتا ہے۔ قرآن کے نزول کا آغاز ماہ رمضان میں ہوا۔ اس نعمت کی شکر گزاری کے لئے اہل ایمان پر ہر سال پورا رمضان کا مہینہ روزے فرض کئے گئے۔ روزہ کی آفات لذتوں اور چٹخاروں کا شوق، طبیعت کا اشتعال، دل بہلانے والی چیزوں کی رغبت کی طرف اور ریا وغیرہ ہیں۔ ان کا علاج روزہ کی مشقت اور اس کی فضیلت و اجر کا استحضار ہے۔ حج اللہ تعالیٰ کے ساتھ تجدید عہد ہے۔ یہ انسان پر ہر راہ سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس سے ایمان کو بالیدگی ملتی ہے اور نفس انسانی اللہ تعالیٰ کی راہ میں مشقتیں برداشت کرنے کا عادی بنتا ہے۔ حج کے

دوران میں شہوانی باتوں، فسق و نافرمانی اور جدال سے سخت منع کیا گیا ہے۔ اور یہ چیزیں تزکیہ نفس اور معرفت کی ترقی کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہیں۔

آخر میں مولانا نے تزکیہ تعلقات و معاملات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ تزکیہ نفس کا راستہ زندگی کے ہنگامہ کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے۔ صوفیاء کے مانند تجرد، ترک دنیا اور انقطاع علائق اور تعذیب روح و نفس اور خدا کا مظہر بننے کا شوق شریعت میں تزکیہ نفس کا طریقہ نہیں۔ اس موضوع پر پوری ایک جلد لکھی ہے۔ دیباچہ میں رقمطراز ہیں :

''اس کتاب میں میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ خدا اور بندوں کے ساتھ ایک آدمی کے تعلق کی بنیادیں قرآن و سنت کی رو سے کیا ہیں اور اس تعلق کے تقاضے کیا ہیں۔ صوفیاء کے رائج کردہ تصور کے مطابق تو آدمی کے مرتبہ کی معراج یہ ہے کہ وہ بھی غیب داں ہو جائے، اس کا فرمایا ہوا گفتہ اللہ ہو جائے، اس کی پھونک دم مسیحا کا کام کرے اور اس کی ذات ذات خداوندی ہی کا ایک پرتو بن جائے۔ میں نے قرآن و سنت کی رو سے بتایا ہے کہ آدمی کا خدا کا مطیع و فرمانبردار بندہ بننا اس کے تزکیہ کا منتہا ہے۔ اسی طرح زندگی سے فرار کوئی نیکی نہیں بلکہ آدمی کا اپنے کنبہ میں والدین کا خدمت گزار اور وفاشعار ہونا، اعزہ و اقارب کے ساتھ احسان کرنا، بیوی بچوں کے ساتھ احسان کرنا، بیوی بچوں کا خیال رکھنا اور ان کی اچھی تربیت کرنا، معاشرے کی اصلاح کرنا اور ریاست کا خیر خواہ ہونا تزکیۂ نفس کے تقاضوں میں شامل ہے۔''

سب سے پہلے انھوں نے اسلام اور ایمان پر بصیرت افروز بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ایمان کا تعلق عقائد سے ہے اور اسلام کا تعلق اعمال سے ہے۔ لیکن بندہ مومن کی زندگی میں یہ دونوں باہم پیوست اور مربوط ہیں اور ان کا لزوم ناگزیر ہے۔ اس کے بعد تعلق باللہ اور اس کے اساسات سے متعلق بحث کی ہے۔ یہ اساسات شکر، عبادت،

اطاعت، اخلاص، محبت، خوف، حیا، وفا اور حمایت، حمیت اور جہاد ہیں۔ شکر کا تعلق دل ،زبان اور عمل سے ہے۔ دل کا شکر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کا اعتراف، زبان کا شکر اللہ تعالیٰ کے لئے حمد کا کلمہ کہنا اور عمل کا شکر نعمتوں کو منعم حقیقی کے منشاء کے مطابق استعمال کرنا ہے۔ شکر عبادت کو مستلزم ہے اور عبادت کا لازمی اقتضاء اطاعت ہے۔ یہ اطاعت رسول کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے کیونکہ وہ خدا کا نمائندہ ہوتا ہے۔ عبادت واطاعت کی روح اخلاص ہے اور اخلاص یہ ہے کہ ہر کام شریعت کے مطابق اور خدا کی رضاجوئی کے لئے کیا جائے۔ ان سب کی جامع محبت ہے اور یہ محبت موقوف ہے معرفت الٰہی پر اور معرفت الٰہی موقوف ہے قرآن مجید میں تدبر و تفکر پر۔ اور اس محبت کا معیار یہ ہے کہ انسان کا ہر رشتہ اس سے کم تر ہو جائے۔ تعلق باللہ کی ایک اساس خوف ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ یہ بات اپنے سامنے رکھے کہ اللہ کی پکڑ جیسی ہے کسی کی نہیں۔ انسان کا کوئی عمل اس سے پوشیدہ نہیں، وہ آخرت میں عدل و حکمت سے فیصلہ کرے گا۔ غلط سفارش، رشوت یا فدیہ نہیں چلے گا۔ حیا کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی صفات بالخصوص خدا کے علم کا محیط کل ہونا مستحضر رہے۔ اور اس کی نافرمانی کرتے وقت یہ سمجھے کہ گویا عین خدا کے سامنے کر رہا ہے اور شرم سے نافرمانی سے رک جائے۔ وفا یہ ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان فطرت اور شریعت کے ذریعہ جو عہد و پیمان باندھے گئے ہیں بندہ اس کو نبھانے اور پورا کرنے کے لئے کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کرے۔ حمیت کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ حق کو مغلوب اور مظلوم دیکھ کر غیرت سے تمتما اٹھے اور حق کی مدد کے لئے ہر چیز سے بے پرواہو کر کھڑا ہو۔ حمایت حمیت کا لازمی تقاضا ہے۔ حمایت حق کی عملی شکل نصرت ہے۔ یہ دونوں چیزیں جہاد کی اساس ہیں اور جہاد کی غایت حق کی سربلندی کے لئے حق کے رستے سے تمام رکاوٹوں کو دور کرنا ہے۔

اس کے بعد مولانا نے مختلف سطحوں پر انسان کے تعلقات کی نوعیت کا جائزہ لیا ہے۔ انسان کا سب سے گہرا تعلق خود اپنے نفس کے ساتھ ہے۔ نفس کے حقوق چار ہیں: معرفت نفس یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو پہچانے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت